بسم اللہ الرحمن الرحیم

فکر و نظر

انسانی حقوق کے نام پر اتاترک ازم کا نفاذ

جنرل پرویز مشرف نے اقتدار سنبھالنے کے چند ہی دنوں بعد جب مصطفیٰ کمال پاشا المعروف اتاترک (ترکوں کا باپ) کو اپنا قومی ہیرو قرار دیا تھا، تو اسی وقت ہی دائیں بازو کے اہل بصیرت کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں کہ کہیں نواز شریف کی کرپٹ حکومت کے خاتمہ کے بعد برپا ہونے والا فوجی انقلاب درحقیقت لادینی انقلاب کی صورت اختیار نہ کر لے۔ مگر شروع شروع میں فوجی حکومت کا ایک تو رعب و دبدبہ ہی اتنا تھا کہ کوئی ان کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، دوسرے لوگ نواز شریف کی حکومت کے خاتمے پر ہی اس قدر خوش تھے کہ وہ باقی نتائج کے متعلق غور و فکر کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔

جنرل پرویز مشرف کے مذکورہ بیان کے خلاف قاضی حسین احمد کی نحیف سی آواز اٹھی تھی جس میں انہوں نے پاکستان میں کمال ازم کے نفاذ کے خلاف سخت مزاحمت پیش کرنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ اس وقت تو جنرل پرویز مشرف نے بھی وضاحت میں بیان دیا تھا کہ ان کے بیان کا وہ مقصد نہیں ہے جو سمجھا گیا ہے۔ مگر گزشتہ ۶/ماہ کے دوران جنرل پرویز مشرف نے جو اقدامات اٹھائے ہیں، ان پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ جو بات انہوں نے اتاترک کے بارے میں کی تھی، وہی ان کے دل کی آواز تھی۔

۲۱/اپریل ۲۰۰۰ء کو انہوں نے انسانی حقوق کنونشن میں خطاب کرتے ہوئے جو اعلانات کئے ہیں، اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اتاترک کو محض اپنا ہیرو سمجھنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ خود اتاترک بننے کے چکر میں ہیں☆ جو بات سابقہ حکومتیں چاہنے کے باوجود نہیں کر سکی تھیں، انہوں نے بے حد دھڑلے سے اس کو عملی جامہ پہنانے کا اعلان کیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ توہین رسالت کے قانون کے تحت کسی شخص کے خلاف اس وقت تک مقدمہ درج نہیں کیا جائے گا جب تک اس کے خلاف الزامات کی ضلع کا ڈپٹی کمشنر تصدیق نہ کر دے گا۔

جب سے توہین رسالتؐ کا قانون ۲۹۵۔ سی بنایا گیا ہے اقلیتی طبقہ کے شر پسندوں، مغربی تہذیب کی دلدادہ این جی اوز، امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کی طرف سے اس قانون کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے۔ وجہ یہ بتائی جاتی رہی ہے کہ اس قانون کا غلط استعمال کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں بے نظیر

☆ محدث کے جنوری ۲۰۰۰ء کے شمارے میں "مصطفیٰ کمال اتاترک اور جنرل پرویز مشرف" کے موضوع پر ایک مقالہ میں ان اندیشوں کو جائزہ لیا گیا تھا جو آج حقیقت کا روپ دھار کر پاکستان کے مستقبل کے بارے میں سب کو پریشان کر رہے ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے اس مضمون کا مطالعہ مفید ہو گا۔

بھٹو کی حکومت نے اس قانون کو تبدیل کرنے کے لیے مسودہ تیار کر لیا تھا جسے حزبِ اختلاف اور عوامی احتجاج کے پیش نظر اسمبلی میں پیش نہ کیا گیا۔ ۱۹۹۹ء میں نواز شریف کی حکومت نے بھی اعلان کیا تھا کہ وہ قانونِ توہین رسالتؐ میں تبدیلی کرنا چاہتی ہے، مگر وہ بھی اپنے مذموم مقاصد کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے تھے کیونکہ عوام نے ایک دفعہ پھر ناموسِ رسول کے تحفظ کے لیے تحریک برپا کرنے کی دھمکیاں دینا شروع کی تھیں۔

اب جبکہ قانون توہین رسالتؐ کا معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا ہے، اقلیتوں کی طرف سے بھی اس کے خاتمہ کا پرزور مطالبہ نہیں کیا جا رہا تھا، حکومت نے اس قانون کے نفاذ کے طریقہ کار میں تبدیلی کا اعلان کر کے حضورِ اکرم ﷺ سے محبت کرنے والے کروڑوں مسلمان پاکستانیوں کے جذبات کو شدید مجروح کیا ہے۔ ایک فوجی حکومت جس نے ہنگامی حالات کے تحت ملک کا کنٹرول سنبھالا ہے اور جس کا بنیادی ایجنڈا ہی ملک کی معاشی حالت کو بہتر بنانا ہے، کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ ملک و قوم کے حساس معاملات پر عوام الناس کے جذبات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس طرح کے فیصلے تھوپنے کی کوشش کرے۔ جنرل پرویز مشرف اصلاحات کے جنوں میں بعض بنیادی حقائق کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ تحفظِ ناموسِ رسولؐ کو بھی وہ شاید جنرل سیلز ٹیکس یا بلدیاتی نظام کے نفاذ جیسا معاملہ سمجھتے ہیں کہ جسے حکومت کی طاقت کے بل بوتے پر عوام کی گردنوں پر مسلط کر دیا جائے گا۔ یہ ایک بے حد حساس معاملہ ہے، حکومت کی طرف سے اس معاملے میں کسی قسم کی نااندیشی ایک نئے قومی انتشار اور فساد کا باعث بن سکتی ہے۔

جنرل مشرف صاحب اگر سیکولر سوچ رکھتے ہیں تو یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے لیکن انہیں یہ ضرور علم ہونا چاہیے کہ مذہبی معاملات میں ذاتی خیالات زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ پاکستانی فوج ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی محافظ ہے، جنرل مشرف پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے معاملے میں تو قوم کے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں مگر جہاں تک پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا معاملہ ہے وہ مغرب کی تنخواہ دار این جی اوز کے خیالات کو آنکھیں بند کر کے قبول کئے جا رہے ہیں۔ افواجِ پاکستان کے سربراہ اور این جی اوز کی سوچ میں یکسانیت کا پایا جانا حیران کن بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔ کارگل کے ہیرو کا این جی اوز کی ہاں میں ہاں ملانا ایک بے حد مایوس کن امر ہے!!

جنرل پرویز مشرف کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ۱۹۲۴ء کے ترکی اور ۲۰۰۰ء کے پاکستان کے حالات میں فرق ہے۔ اگر اس وقت ترک قوم نے اتاترک کی مزاحمت نہ کی تھی، تو اس کی بنیادی وجہ ان کا جنگِ عظیم میں شکست سے دوچار ہونا اور یورپی اقوام کے ہاتھوں ذلیل ہونا تھا۔ پاکستان میں ایسے حالات نہیں ہیں اور نہ ہی پاکستانی قوم اپنے مزاج کے اعتبار سے کسی اتاترک کو قبول کرے گی۔

یہ استدلال سرے سے درست ہی نہیں ہے کہ چونکہ ۲۹۵۔سی کا بعض لوگ غلط استعمال کرتے ہیں لہٰذا اس کے طریقہ کار میں تبدیلی لائی جائے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اقلیتوں اور این جی اوز کا یہ دعویٰ

مبنی بر حقیقت نہیں ہے کہ قانونِ توہین رسالت کے تحت درج کیے جانے والے تمام مقدمات بے بنیاد ہیں۔ کوئی ایک آدھ واقعہ ایسا ہو بھی سکتا ہے، مگر باقی واقعات بے بنیاد یا ذاتی دشمنی کے نتیجہ میں وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ کوئی بھی سچا مسلمان اپنی ذاتی رنجش کے لیے نبی مکرمؐ کے نامِ گرامی کا غلط استعمال کرتے ہوئے کسی غیر مسلم کے خلاف کوئی مقدمہ درج نہیں کرائے گا۔ پاکستانی اقلیتوں کے بعض جنونی ارکان مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ کی توہین کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ عیسائیوں میں صلیبی جنگوں کی کدورتیں اب بھی باقی ہیں۔ یہاں تفصیلات☆ کی گنجائش نہیں ہے، تاریخ اس دعوی پر گواہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ صرف قانون توہین رسالتؐ کے تحت قائم کردہ مقدمات میں ہی ڈپٹی کمشنر کی پیشگی اجازت کو کیوں ضروری قرار دیا جائے، دیگر خطرناک جرائم میں اس اجازت کو آخر ضروری کیوں نہیں سمجھا گیا؟ ایسا اگر اقلیتوں کے خود ساختہ حقوق کے تحفظ کے پیش نظر کیا جارہا ہے تو پھر اکثریت کے حقوق کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ اگر کوئی اقلیتی رکن مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کا مقدمہ دائر کرنا چاہے، تو اسے بھی ڈپٹی کمشنر سے پیشگی اجازت لینی چاہیے کیونکہ اقلیتیں بھی اکثریت کے خلاف جھوٹے مقدمات درج کرانے کے اتنے ہی امکانات رکھتی ہیں جتنا کہ اکثریت کے بارے میں خدشہ کیا جاسکتا ہے۔

جنرل اشرف صاحب کے این جی اوز برانڈ مشیروں نے انہیں یقیناً حالات کی یک رخی تصویر بھی دکھائی ہوگی۔ کسی بات کے بارے میں معروضی فیصلہ کرنے کے لیے دونوں اطراف کی تصاویر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی اس معاملے میں پیشگی اجازت کی شرط کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ توہین رسالتؐ کے بہت سے واقعات کے بارے میں مقدمات محض اس بنا پر درج نہیں کیے جاسکیں گے کہ فوری طور پر ڈپٹی کمشنر کی اجازت کا حصول ممکن ہی نہیں ہوگا۔ بالخصوص ایسے تمام واقعات جو ضلعی ہیڈ کوارٹر سے بہت دور وقوع پذیر ہوں گے۔ بعض ضلعوں کی جغرافیائی حدود اتنی وسیع ہیں کہ لوگوں کا ضلعی صدر مقام تک آنا ہی دشوار ہوتا ہے۔

اگر تو جنرل پرویز مشرف چاہتے ہیں کہ توہین رسالتؐ قانون کے مطابق صحیح مقدمات کا اندراج بھی نہ ہو تو پھر وہ مذکورہ تبدیلی کو ضرور نافذ کریں۔ لیکن اگر ان کے ذہن میں صرف اس قانون کے غلط استعمال کو روکنا ہے، تو پھر انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ڈپٹی کمشنر کی اجازت کو شرط بنا کر اس قانون کے صحیح استعمال کرنے کے امکانات کو بھی عملاً ختم کر دیا جائے گا، جیسا کہ گذشتہ چند برسوں میں دیکھنے میں آیا ہے۔ جناب فاروق لغاری جب صدر تھے تو انہوں نے تمام ڈپٹی کمشنروں کو ہدایات ارسال کی تھیں کہ

☆ محدث میں اخباری جائزوں اور عالمی رپورٹوں پر مشتمل ایک تحقیقی مضمون میں بڑی تفصیل سے قانون توہین رسالت میں حالیہ تبدیلی کے محرکات و مضمرات پر ۱۹۹۹ء میں مقالہ شائع کیا گیا تھا۔ ۴۰ سے زائد صفحات پر شائع ہونے والے اس مقالہ میں اس موضوع کے جملہ پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

وہ قانونِ توہین رسالتؐ کے تحت مقدمات کو حتی الامکان حد تک درج نہ ہونے دیں۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور دیگر دینی جماعتوں کی طرف سے مسلسل یہ شکایات کی جاتی رہی ہیں کہ ان کی طرف سے بار بار گذارش کے باوجود ایسے افراد کے خلاف ضلعی انتظامیہ مقدمات درج نہیں کرتی جو واضح طور پر توہین رسالت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مرشد مسیح نامی ایک شخص گذشتہ ایک سال سے لاہور میں احمدی لاہوری گروہ کے ہیڈ کوارٹر میں چھپا ہوا ہے، اس بدبخت نے جناب رسالتمآبؐ کے خلاف گستاخانہ کلمات لکھ کر متعدد علماءِ کرام کو ارسال کیے تھے۔ یہ بات جمعیت علمائے اسلام کے راہنما مولانا اجمل قادری اور مولانا اسمٰعیل شجاع آبادی نے ۲۰ سے زیادہ دینی جماعتوں کے نمائندوں کے اجلاس کے دوران کہی جو جولائی ۱۹۹۹ء میں منعقد کیا گیا تھا۔

جنرل پرویز مشرف نے جس انسانی حقوق کنونشن میں مذکورہ اعلان کیا، وہ 'احترامِ انسانیت' کے فروغ کے لیے بلایا گیا تھا۔ تکریم آدم کو دورِ جدید کے انسانی حقوق کے تصور میں اہم مقام حاصل ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک فرد کے انسانی حقوق کے متعلق اس قدر حساسیت کا اظہار کرنے والے آخر محسن انسانیت ﷺ کے حقوق کو فراموش کیوں کر جاتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کی ناموس کے تحفظ کے حقوق مسلمانوں کے نزدیک اُمّ الحقوق ہیں۔[1] انسانی حقوق کا کوئی بھی چارٹر کاغذ کے ایک بیکار ٹکڑے سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا، اگر یہ کائنات کی عظیم ترین ہستی کے حقوق کے تحفظ میں ناکام رہتا ہے۔

جنرل پرویز مشرف کی چند دیگر پالیسیاں بھی اسلامی شریعت کی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ سیاسی معاملات میں خواتین کی مساوی شرکت شریعتِ اسلامیہ کی روح کے منافی ہے۔[2] عورت اور مرد میں برابری کا جو تصور مغرب میں پیش کیا جارہا ہے، اسلام اس کی تائید نہیں کرتا۔ مذکورہ کنونشن میں جنرل پرویز مشرف نے غیرت کے نام پر قتل کے لیے سزائے موت کا اعلان کیا ہے۔ یہ مطالبہ بھی این جی اوز کی طرف سے کیا جاتا رہا ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں فوری اشتعال کے نتیجے میں بالخصوص آبرو کے معاملے میں اشتعال میں آکر کیے جانے والے قتل کی وارداتوں کو 'قتل عمد' نہیں سمجھا جاتا۔ یہ 'قتل خطا' کے زمرے میں آتا ہے۔[3] اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اسلامی فقہ کے ماہرین کی آراء طلب کی جائیں، مگر شروع ہی سے موجودہ فوجی حکومت نے علماء اور دینی طبقہ کو نظر انداز کرنے کی پالیسی اپنا رکھی ہے۔ خالص دینی معاملات میں بھی این جی اوز کے 'مفتی صاحبان' کی آرا کو بنیاد بنا کر فیصلے کیے جارہے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف نے خُلع کے قوانین کو مزید آسان بنانے کا اعلان بھی کیا ہے۔ نہ جانے مزید آسان بنانے کی غرض وغایت کیا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ شاید ہی کوئی عورت ایسی ہوگی جو عدالت میں خُلع کی درخواست دے اور اسے خُلع کا حق نہ ملا ہو۔ خُلع کو آسان بنانے کے نام پر

(۱) محدث کے آئندہ شمارے بابت ربیع الاوّل ۱۴۲۱ھ میں "اُمّ الحقوق" کے موضوع پر تفصیلی مقالہ ملاحظہ فرمائیں۔
(۲) مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں مقالہ: "خواتین کی اسمبلیوں میں نمائندگی" (مطبوعہ 'محدث' جنوری ۱۹۹۸ء)
(۳) محدث جون ۱۹۹۹ء میں شائع شدہ تفصیلی مضمون "غیرت کے نام پر قتل، قانونی واسلامی نقطہ نظر" کا مطالعہ فرمائیں

عورتوں کو طلاق کا حق دینے کا منصوبہ بن رہا ہے اور یہ این جی اوز کی عورتوں کا دیرینہ مطالبہ بھی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ امر سراسر مداخلت فی الدین شمار ہو گا۔

ابھی تک دینی جماعتوں کی طرف سے جنرل پرویز مشرف کی کھل کر مخالفت نہیں کی گئی۔ اس کی بنیادی وجہ غالباً موجودہ حکومت کی کشمیر پالیسی اور سی ٹی بی ٹی کے معاملے میں امریکی دباؤ کو قبول نہ کرنے کی پالیسی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ محض حکومت کی قابل تعریف کشمیر پالیسی کی وجہ سے دیگر غیر اسلامی پالیسیوں سے چشم پوشی کا جواز نکلتا ہے؟ ایوب خان نے عائلی قوانین کو نافذ کر کے جس سیکولرازم کی بنیادیں رکھ دی تھیں، آج اسی سیکولرازم کی عمارت کے بقیہ حصہ جات تعمیر کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جارہا ہے۔ سیکولر اور اسلام دشمن این جی اوز مملکت پاکستان میں اپنے ایجنڈے کی تکمیل میں ہر طرح کے قوانین بنانے کے لیے آزاد ہیں اور انہیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے۔ قاضی حسین احمد صاحب نے پاکستان میں کمال ازم کے نفاذ کی راہ میں مزاحمت پیش کرنے کا اعلان کیا تھا، کمال ازم تو مرحلہ وار نافذ کیا جارہا ہے، مگر مزاحمت کا کہیں نام و نشان نہیں، محض بیانات سے تو ایسے ثقافتی و تہذیبی انقلابات کا راستہ نہیں روکا جاسکتا۔ مولانا فضل الرحمٰن نے بھی این جی اوز کے خلاف جہاد کا اعلان کیا ہے، مگر یہ جہاد بھی فی الحال لسانی جہاد تک محدود ہے، عملی جہاد کی صورتیں سامنے نہیں آرہی۔ گذشتہ برسوں میں جب بھی بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کی حکومتوں نے قانونِ توہین رسالتؐ کے نفاذ کے متعلق مذکورہ تبدیلی کا عندیہ دیا، دینی جماعتوں نے فوری اور شدید ردّ عمل کا اظہار کیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جنرل پرویز مشرف کے اعلان کے خلاف بھی ایسا شدید ردّ عمل ظاہر کر سکیں گی؟ اگر نہیں تو پھر کیا ناموسِ رسول کے تحفظ کے تقاضے بھی حکومتوں کو بدلنے کے ساتھ بدل جایا کرتے ہیں؟ کیا اب وقت نہیں آگیا کہ وہ آگے بڑھ کر این جی اوز کی مداخلت فی الدین کا راستہ روکیں؟

یہ وہ سوالات ہیں، اگر ان کا فوری جواب تلاش نہ کیا گیا تو پاکستان کا اسلامی تشخص برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ آخر میں ہم صدر پاکستان جناب محمد رفیق تارڑ کی توجہ اس مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے روزنامہ خبریں میں اپنے ایک مضمون میں تحریر فرمایا تھا

> "دنیا کے ایک ارب سے زیادہ مسلمان حضورِ نبی کریم ﷺ سے انتہائی جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ آپؐ کی ناموس کا معاملہ ہو تو پھر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ نام نہاد اہم شخصیتوں کا حدود اربعہ کیا ہے؟ وہ کتنی طاقتور ہیں اور کیا چاہتی ہیں پھر مسلمان اپنے پیارے رسول پر اپنی جان، اولاد، مال، والدین غرضیکہ ہر قیمتی متاع قربان کرنے کے لیے تیار نظر آتے ہیں" (۲۴/اپریل ۱۹۹۷ء)

یہ بات انہوں نے اس وقت تحریر کی تھی جب وہ محض سینٹ کے ایک رکن تھے اب جبکہ وہ صدرِ پاکستان ہیں، وہ اپنی جان، مال، اولاد وغیرہ قربان کیے بغیر بھی اس سلسلے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک محبِّ رسول صدرِ پاکستان کے ہوتے ہوئے قانونِ توہین رسالتؐ کو عملاً غیر مؤثر بنا دیا جاتا ہے، تو کیا وہ یہ گوارا فرمالیں گے؟؟